ĪQĀN- Vol: 03, Issue: 01, Dec-2020
DOI: 10.36755/iqan.v3i01.234 PP: 01-20

OPEN ACCESS
ĪQĀN
pISSN: 2617-3336
eISSN: 2617-3700
www.iqan.com.pk

تفسیرِ قرآن میں لغتِ عرب سے استشہاد کی حیثیت اور غلام احمد پرویز کے استدلالات کا تحقیقی جائزہ

Arabic Language as Source of Qur'anic Exegeses: Study of Ghulam Ahmad Pervaiz's Arguments

*** *Dr. Abdul Razzaq***
Assistant Professor, Department of Islamic Studies,
Govt. Postgraduate College, Samundri, Faisalabad, Pakistan. <*abdulrazzaq6046@gmail.com*>

*** *Dr. Zafar Iqbal***
Lecturer, Department of Quran & Tafseer,
Allama Iqbal Open University, Islamabad, Pakistan. <*drzafariqbal@aiou.edu.pk*>

Version of Record
Received: 12-Jul-20
Accepted: 01-Nov-20
Online/Print: 30-Dec-20

ABSTRACT

Principles of Quranic exegesis are illustration of Qur'an, gradually by Qur'an, Hadith, sayings of companions of holy prophet (SAW), Arabic literature, as well as rational reasoning. Study of Quranic commentaries reveals that, although, there is a consensus on these principles being used for Quranic exegeses but there are variations in understanding and application of these sources. In this context, the commentaries also differ from one scholar to others. One of these scholars in the sub-continent is Ghulam Ahmad Pervaiz, author of Urdu exegesis of Qur'an, whose understanding and application of these principles completely differ from mainstream scholars. Mr. Pervaiz used the Arabic native language and dictionaries as a basic source of Quranic exegeses, while rest of the interpreters use these sources as secondary source. Similarly, Mr. Pervaiz rejected the principle of Quranic exegesis 'illustration by Hadith'. This article discussed the validity and authenticity of Arabic language as a source of Quranic exegesis and Mr. Pervaiz's application of it by disagreeing with mainstream scholars. Analysis made based on basic exegesis principles and historical traditional literature.

Keywords: *Quran; Arabic Language; Ghulam Ahmad Pervaiz; Exegesis; Validity; Disagreement.*

CC BY

تعارف:

جمہور علمائے مفسرین نے مآخذ تفسیر میں سے پانچواں ماخذ لغتِ عرب کو قرار دیا ہے۔قرآن مجید کا نزول چونکہ عربی زبان میں ہوا ہے، اس لئے عہد صحابہ سے لے کر آج تلک تمام مفسرین ، تفسیرِ قرآن میں لغتِ عرب سے استدلال واستشہاد کرتے رہے ہیں۔جس سے الفاظ غریبہ اور مشکلات القرآن کی تشریح وتوضیح میں کلام عرب کی ضرورت واہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ تفسیر قرآن کے لئے لغتِ عرب کے استعمال کی امثلہ تو تمام مفسرین صحابہ کے ہاں بکثرت ملتی ہیں لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ شہرت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"الشعر ديوانُ العرب فإذا خفي علينا الحرف من القرآن الذي أنزله الله بلغة العرب رجعنا إلى ديوانها فالتمسنا معرفة ذلك منه"[1]

"شعر عرب کا دیوان ہے، جب ہم پر اس قرآن کا کوئی لفظ معنی کے اعتبار سے مخفی ہو جسے اللہ تعالی نے عربی لغت میں نازل فرمایا ہے، تو ہم عرب کے دیوان کی طرف رجوع کرتے ہیں پھر وہاں سے ہمیں اس کا معنی معلوم ہو جاتا ہے"

عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی بھی آپ ﷺ کے بعد دیگر صحابہ کرام سے مفردات قرآن کے معانی کے بارے میں اکثر سوال کیا کرتے تھے، کیونکہ وہ سب اہل لغت تھے۔ عہدِ صحابہ سے لے کر آج تک کوئی بھی قابلِ ذکر مفسر ایسا نہیں گزرا جس نے تفسیرِ قرآن میں کلامِ عرب کی ضرورت اہمیت کا اقرار نہ کیا ہو۔بلکہ جمہور اہل علم نے لغتِ عرب میں مہارت کو مفسر کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔اس لئے کہ قرآن کی زبان عربی ہے۔ارشاد ربانی ہے:

"إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُون"[2]

"بلاشبہ ہم نے اسے عربی قرآن نازل کیا تاکہ تم سمجھ سکو"

تفسیر قرآن میں جہاں کلامِ عرب کی بہت زیادہ احتیاج و ضرورت ہے تو دوسری طرف اگر کلامِ عرب سے تفسیر کرنے کے اصول وضوابط کو نظرانداز کرکے تفسیر کی جائے تو اس سے مفاسد کثیرہ جنم لیتے ہیں اور ضلالت وگمراہی کے لامتناہی دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں اور انسان خود بھی گمراہی وضلالت کے گرداب میں دھنستا ہے اور دوسروں کو بھی اس دھکیلتا چلا جاتا ہے۔

پوری دنیا کی طرح برصغیر پاک وہند میں بھی بہت سے گمراہ فرق نے کلامِ عرب سے تفسیر کرتے ہوئے ان مسلمہ اصول وضوابط سے انحراف کیا ہے جو علمائے امت کے ہاں متفقہ ہیں۔انہی تفاسیر میں سے تفسیر مطالب الفرقان از غلام احمد پرویز ہے۔زیر نظر مقالہ میں سب سے پہلے کلامِ عرب سے تفسیر کرنے کے اصول وضوابط کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر ان اصولوں کی روشنی میں مذکور تفسیر کا تطبیقی و تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔جس سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف سے کلامِ عرب کے ساتھ تفسیر کرتے ہوئے کس نوع کے تسامحات صادر

---

[1] عبدالرحمن بن ابی بکر السیوطی، **الاتقان فی علوم القرآن** (مصر: الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ۱۳۹۴ھ)، ۲: ۶۷.

[2] یوسف: ۲.

ہوئے ہیں اور کن کن مسلمہ اصولوں کو پس پشت ڈال کر لغتِ عرب سے استشہاد کے ذریعے تفسیر قرآن کو اپنے خود ساختہ نظریات کے تابع بنانے کی سعی کی ہے؛

تفسیر قرآن میں لغت عرب سے استدلال واستشہاد کے اصول وضوابط:

ا۔ قرآن مجید سے الفاظ کے معانی کی تعیین:

اللہ رب العزت نے بلاشبہ قرآن عربی زبان میں نازل فرمایا اور عرب اہل زبان ہونے کی بناپر نہ صرف اس کے معانی و مطالب کا فہم وادراک اہل عجم کی بہ نسبت سہولت وآسانی سے کرلیا کرتے تھے بلکہ وہ اس کے اعلیٰ وارفع اسلوب اور دل نشین اندازِ بیان سے محظوظ اور اس کی فصاحت و بلاغت، اعجاز اور علو شان سے متاثر و مرعوب ہو کر اس کی حقانیت وصداقت کی گواہی بھی دیتے تھے، مگر عربوں کی مادری زبان میں نزولِ قرآن کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ وہ قرآن کی ہر ہر آیت اور لفظ کو محض اپنی زبان دانی کی بناپر کماحقہ سمجھنے پر قدرت رکھتے تھے اور قرآن فہمی کے لئے ان کو قرآنی تشریحات وتوضیحات اور تعلیمات نبوی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

عربی زبان میں وسعت اور گہرائی درجہ کمال تک پہنچی ہوئی ہے چنانچہ ایک ایک لفظ کے بہت سے مدلولات عربی لغت میں ملتے ہیں اور سب ہی لغوی اعتبار اس لفظ کی مراد ہو سکتے ہیں اور اہل عرب کے وہ لغوی معانی معتبر اور درست بھی ہیں۔ تفسیر قرآن میں، ان میں سے کون سا معنی و مفہوم مراد لیا جائے گا؟ تو اس کی تعین کا سب سے بہترین اور عمدہ طریقہ یہ ہے کہ اسے خود قرآن میں کی روشنی میں کیا جائے کہ قرآن نے کسی دوسرے مقام پر اس کے متعدد معانی میں سے کسی کی تعیین کی ہے یا نہیں، اگر کی ہے تو وہی معنی مراد لیا جائے گا، مثلاً:

"إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا"[1]

"بلاشبہ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے اے گھر والو ناپاکی کو دور کردے اور تمہیں اچھے سے پاک کردے"

آیت مبارکہ میں اہل بیت سے کیا مراد ہے؟ آیا اس میں ازواج مطہرات شامل ہیں یا نہیں؟ اس کی نظیر قرآن کا دوسرا مقام ہے جہاں یہی لفظ اللہ تعالی نے ابراہیم علیہ السلام اور ان کی زوجہ کے لئے استعمال کیے ہیں:

"أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ رَحْمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ"[2]

"کیا تو اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو اللہ کی رحمت اور اس کی برکت تم پر ہو اے گھر والو"

اس آیت مبارکہ میں جواب ابرہیم علیہ السلام کی اہلیہ کو ہی دیا رہا ہے اور وہ اہل بیت میں شامل ہیں۔ لہٰذا سورہ احزاب کی آیت مبارکہ میں بھی ازواج مطہرات سب سے پہلے شامل ہیں۔ اسی طرح اسراء کا لفظ ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

---

[1] الاحزاب: ۳۳.

[2] ھود: ۷۳.

"سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى"[1]

"پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کروائی اپنے بندے کو ایک رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک"

سوال یہ ہے کہ آپ ﷺ کو معراج حالت بیداری میں ہوئی یا حالت نوم میں؟ چنانچہ یہی لفظ قرآن میں دیگر جن مقامات پر استعمال ہوا ہے، وہاں حالت بیداری کے معنیٰ کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً:

"وَأَوْحَيْنَا إِلَى مُوسَى أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي إِنَّكُمْ مُتَّبَعُونَ"[2]

"اور ہم نے موسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو لے کر راتوں رات روانہ ہو جاو، تمہارا پیچھا یقینا کیا جائے گا"

"فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ"[3]

"تم رات کے کسی حصے میں اپنے گھر والوں کو لے کر بستی سے روانہ ہو جاو"

مذکورہ بالا ارشادات میں اللہ تعالی نے ہود اور موسی علیہما السلام کو اپنے متبعین کو حالت بیداری میں لے جانے کا حکم دیا اور انہوں اس کی تعمیل بھی حالت بیداری میں ہی کی، نہ کہ حالت نوم میں۔ بالکل اسی طرح اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو معراج بھی حالت بیداری میں ہی کروائی ہے کیونکہ دونوں الفاظ کا مصدر ایک ہے تو پھر معنی بھی ایک ہی ہوگا، مختلف نہیں ہو سکتا۔

حدیث سے لفظ کا معنی مراد لینا:

الفاظِ قرآنی کی تشریح و تفسیر سمجھنے کا دوسرا اور معتبر ترین ذریعہ حدیث وسنت رسول ﷺ ہے کیونکہ آپ ﷺ کا منصب ہی تعلیم و تبیینِ قرآن ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

"وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ"[4]

"اور ہم نے آپ کی طرف ذکر کو نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کو بیان کر دیں جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا ہے"

اسی طرح ارشاد پاک ہے:

"وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ"[5]

"اور وہ نبی انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں"

---

[1] الاسراء:۱.

[2] الشعراء:۵۲.

[3] ھود:۸۱.

[4] النحل:۴۴.

[5] البقرۃ:۱۲۹.

نبی کریم ﷺ کے بیان کردہ معنی و مفہوم سے میں تاویلات کرنا اور انہیں بعینہٖ ماننے میں حیل وحجت کرنا، در حقیقت روگردانی اور انحراف کے زمرے ہی آتا ہے۔ چناچہ وہ تمام شرعی اصطلاحات جن کے معانی احادیث سے متعین ہیں ان میں تعیین معنی کے لئے ہمیں کسی اور مصدر کی طرف رجوع کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔اسی حوالے سے امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

> **"ومما یبغی ان یعلم ان الالفاظ الموجودة فی القران والحدیث اذا عرف تفسیرها وما ارید من جهة النبیﷺ لم یحتج فی ذالک الی الاستدلال الی اقوال اهل اللغة ولا غیرهم ولذلک قال الفقهاء الاسماء ثلثة انواع؛ نوع یعرف حده بالشرح کالصلاة والزکاة ونوع یعرف حده باللغة کالشمس والقمر ونوع یعرف حده بالعرف کالقبض والمعروف"[1]**

> "اور ان باتوں میں سے یہ بھی ہے جن کا جاننا ضروری ہے کہ جو الفاظ قرآن وحدیث میں موجود ہیں اور ان کی تفسیر نبی کریم ﷺ کی طرف سے موجود ہو تو یہاں اہلِ لغت و دیگر حضرات کے اقوال کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی اسی وجہ سے فقہاء نے کہا ہے کہ اسماء تین قسم کے ہیں ایک قسم وہ ہے جن کی تعریف شریعت نے کردی ہے جیسے صلوۃ وزکوۃ اور دوسری قسم وہ ہے جس کی تعریف لغت سے معلوم ہوتی ہے جیسے شمس و قمر اور تیسری قسم وہ ہے جس کی تعریف عرف سے معلوم ہوتی ہے جیسے قبضہ اور معروف"

لہٰذا قرآن پاک میں موجود تمام اصطلاحات جن کی تشریح وتوضیح احادیث مبارکہ سے واضح ہے ان میں اہل لغت کی طرف رجوع کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ایسی تفسیر درست نہیں ہو گی۔

اقوال صحابہ سے استدلال:

اگر کسی لفظ کے لغوی اعتبار سے کئی معانی ہوں اور قرآن وحدیث سے ان میں سے کسی ایک کی تعین مشکل ہو تو اقوال صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ کیونکہ صحابہ کرام ہی قرآن کے اولین مخاطب تھے اور انہیں کے زمانے میں قرآن کا نزول ہوا تھا اور وہ پس منظر اور محاورہ عرب سے بھی سب سے زیادہ واقف تھے۔

سیاق وسباق کے ذریعے معنی متعین کرنا:

سیاق وسباق اور ربطِ آیات کی تفسیر قرآن میں اہمیت تمام مفسرین کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت ہے اور یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ کسی کے کلام کو اس کے سیاق وسباق سے توڑ کر معنی و مفہوم مراد لینا کسی طرح درست اور قابل فہم بات نہیں ہے۔اس ضمن میں علامہ عبدالرحمٰن بن ناصر لکھتے ہیں:

> "قرآنی آیات میں کوتاہ بین لوگوں کو تعارض نظر آتا ہے، ان میں ہر قسم کی آیات کے مفہوم کو ان کے موقع و محل کی مناسبت سے متعین کرنا ضروری ہے، یہ بات قرآن حکیم کے متعدد مقامات پر نظر آتی ہے"[2]

---

[1] احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہ، **مجموع الفتاویٰ**(الریاض: دار عالم الکتب، ۱۹۹۱ء)، ۲۷۶.

[2] عبدالرحمن بن ناصر سعدی، **فہم قرآن کے زریں قواعد**، ت. میاں فیض رسول (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۲۰۰۶ء)، ۴۴.

ارشادِ باری ہے:

"يَابُنَيَّ إِنِّي أَرَى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَى"[1]

"اے میرے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں، اب سوچ کر بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟"

آیت کے سیاق و سباق میں غور کیا جائے تو بغیر کسی حیل و حجت اور تکلف کے یہ بات روز روشن کی واضح ہوتی ہے کہ اس میں مخاطب اسماعیل علیہ السلام ہیں نہ کہ اسحاق علیہ السلام، کیونکہ ان کا ذکر دس آیات کے بعد الگ سے حرف عطف کے ذریعے قرآن نے 'وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِينَ'[2] کے الفاظ میں کیا ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آیت میں حلیم اور ذبیح اسماعیل علیہ السلام ہیں۔

مروج مطالب و مفاہیم مراد لینا:

الفاظ قرآن کے وہ معانی معتبر اور قابل قبول ہوں گے جو اہل عرب نزول قرآن کے وقت مراد لیتے تھے۔ مرور زمانہ سے اگر کسی لفظ کا معنی و مدلول بدل گیا ہو تو اس سے تفسیر قرآن میں غلطی کا قوی امکان ہو سکتا ہے۔ لہٰذا نزول قرآن کے وقت رائج عربی اور جدید عربی میں الفاظ کے معانی و مفاہیم میں جو فرق بعض دفعہ رونما ہو جاتا ہے مفسر کو اسے مد نظر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ اور قدیم و جدید عربی کے اختلاف کی صورت میں ترجیح اسی معنی و مفہوم کو ہو گی جو نزول قرآن کے وقت معروف و متداول ہوں۔ مثلاً قریۃ کا لفظ آج کل دیہات جب کہ نزول قرآن کے وقت مصر یعنی شہر کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ قرآن میں اصحاب کہف کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا"[3]

"اور وہ (اصحابِ کہف) اپنے غار میں تین سو سال اور مزید نو سال (سوتے) رہے"

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت مبارکہ میں شمسی سال مراد ہیں یا قمری؟ تو جمہور مفسرین نے اس سے قمری سال مراد لیا ہے، کیوں کہ اہل عرب کے ہاں اسی کا رواج و عرف تھا شمسی حساب متداول نہ تھا۔

حقیقی اور مجازی معنی کے فرق کو مد نظر رکھنا:

ہر زبان اور لغت میں اکثر و بیشتر الفاظ اپنی حقیقی اور وضعی معانی میں استعمال ہوتے ہیں اور یہی ہر زبان کا اصل قاعدہ اور اصول ہے کہ جب الفاظ قرائن سے خالی ہوں تو ان کے حقیقی اور وضعی معانی ہی معتبر ہوں گے۔ لیکن جب قرائن اس بات کی طرف اشارہ کریں کہ یہاں الفاظ کے حقیقی نہیں بلکہ مجازی معانی مراد ہیں تو پھر مجازی معنی مراد لینا ہی اصل ہے تاکہ متکلم و قائل کی رضا و منشا کے مطابق اس کے کلام کی تفسیر ہو سکے۔ اس اصول سے انحراف سے تفسیر قرآن میں بہت سے مفاسد اور گمراہیاں پیدا ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر:

---

[1] الصافات: ۱۰۲.

[2] الصافات: ۱۱۲.

[3] الکھف: ۲۵.

"رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَى"[1]

"اے میرے پروردگار مجھے دکھایئے کہ آپ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟"

اس آیت مبارکہ میں رویئت قلبی یا منامی مراد لینا مجازی معنی ہے جو یہاں مراد نہیں ہے بلکہ حقیقی معنی یعنی رویئت حقیقی مراد ہے، یہاں پر مجازی معنی مراد لینا متکلم و قائل کی منشا و مقصود کے خلاف ہوگا اس لئے وہ درست نہیں ہے۔

مشہور و ظاہری معنی کو ترجیح دینا:

ہر زبان میں کچھ الفاظ کو اہل زبان متعدد معانی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ عربی زبان کی وسعت و گہرائی کی بناپر ایسے بہت سے الفاظ ہیں جن کے متعدد معانی ہوتے ہیں، تو ان میں سے کون سا معنی مراد لیا جائے گا تو اس میں اہل زبان کے ہاں جو معنی زیادہ مشہور و معروف ہوگا وہی مراد ہوگا۔ ہاں اگر قرآن وسنت یا دیگر قرائن سے غیر معروف معنی کی طرف اشارہ ملتا ہو تو اسے مراد لیا جائے گا۔

لغت عرب سے استشہاد اور تفسیر بالعقل:

تمام مفسرین نے مصادر تفسیر میں لغت عرب کو پانچویں جب تفسیر بالعقل کو چھٹے نمبر پر رکھا ہے۔ اسی طرح استشہاد لغت عرب میں تعیین معنی کے دیگر مصادر کے بعد عقل کے ذریعے سے بھی لغوی معنی کی تعیین کی جائے گئی۔ لیکن اس کے لئے ان تمام شرائط[2] پر عمل کرنا ضروری ہوگا جو تفسیر بالرائے کے سلسلے میں علمائے امت نے ذکر کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ

- اس لفظ کے معانی متعین کرنے میں قرآن و حدیث اور اقوال صحابہ سے کوئی صراحت منقول نہ ہو
- وہ تفسیر شریعت کے دیگر مسلمہ اصولوں کے خلاف نہ ہو
- اپنے خود ساختہ نظریات کو زبردستی تفسیر قرآن میں لانے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ قرآن جس طرف رہنمائی کرے اسے تفسیر قرار دیا جائے
- عقل کو حاکم کا درجہ نہ دیا جائے بلکہ ایک ذریعے کے درجے میں رکھا جائے
- اسی قطعی اور یقینی تفسیر قرار نہ دیا جائے بلکہ ظنی درجہ میں رکھا جائے
- تفسیر کرنے والا اس کا اہل بھی ہو یعنی مفسر کے لئے ضروری علوم سے کماحقہ واقف ہو

غلام احمد پرویز (۱۹۸۵ء) اور ان کے اصول تفسیر:

تفسیر القرآن بالقرآن:

جمہور مفسرین کی طرح پرویز صاحب بھی تفسیر القرآن بالقرآن کو سب سے زیادہ فوقیت دیتے ہیں۔ چنانچہ پرویز صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] البقرۃ: ۲۶۰.

[2] محمد بن جریر الطبری، **جامع البیان عن تاویل آي القرآن** (ھجر: دار ھجر للطباعۃ والنشر، ۲۰۰۱ء)، ۱: ۳۴، ۳۳.

''ابتداء میں نے مروجہ قدامت پسندانہ طریق پر قرآن کا مطالعہ کیا لیکن جب حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پرکھنے کا شعور پیدا ہوا تو میں نے دیکھا کہ جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا تھا وہ حقیقت سے بہت دور لے گیا تھا۔ برسوں تک میں ریب و تشکیک کی پرخار وادیوں میں وقف کرب واضطراب رہا، بالآخر میری قسمت نے یاوری کی اور حقیقت میری سمجھ میں آئی کہ قرآن سمجھنے کا صحیح طریق کیا ہے۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو نور یعنی روشنی کہا ہے اور روشنی اپنے وجود کی دلیل آپ ہوتی ہے، اسے تلاش کرنے کے لئے خارجی چراغوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لہٰذا قرآن خود قرآن سے سمجھا جاسکتا ہے''[1]

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''قرآن فہمی کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس کی بیان کی ہوئی جس حقیقت کی تفصیل مطلوب ہو، وہ قرآن ہی سے نکالی جائے، کیوں کہ قرآن کی تفسیر اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے۔ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ[2] پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے''[3]

تفسیر بالاحادیث، اقوال صحابہ وتابعین سے مکمل اجتناب:

جمہور امت و مفسرین سے جو پرویز صاحب کا سب سے زیادہ اختلاف ہے وہ تفسیر قرآن اور تعیین معنی میں احادیث النبی ﷺ سے انکار ہے۔ اس حوالے سے اصولی موقف بیان کرتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں:

''آیات کی تشریح میں روایات سے مدد لی جاسکتی ہے لیکن چونکہ روایات غیر یقینی اور ظنی ہیں اس لئے ان پر تفسیر کا مدار نہیں رکھا جاسکتا''[4]

جس طرح پرویز صاحب احادیث کی روشنی میں تفسیر قرآن کے قائل نہیں ہیں اسی طرح صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال بھی ان کے نزدیک تفسیر قرآن میں حجت نہیں ہیں۔

مذکورہ اصول کا تحقیقی جائزہ:

پرویز صاحب کا یہ اصول عقل و نقل کے کسی بھی پیمانے کے مطابق درست اور قابل تسلیم نہیں ہے اور سلف وخلف میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔ جاذب نظر الفاظ اور بہترین تراکیب کا سہارا لے کر جس طرح بھی اسے پیش کیا جائے اس کا حاصل اور لب لباب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ افصح العرب اور اللہ تعالی کی طرف سے تفسیر و تشریح قرآن کے منصب پر فائز ذات نبیِ معصوم کے بجائے عام غیر معصوم شخص کی قیاسی بلکہ وہمی تشریح و تفسیر پر اعتبار کرلیا جائے۔ قرآن پاک سے آپ ﷺ کا جو بھی تعلق مانا جائے

---

[1] غلام احمد پرویز، **تفسیر مطالب الفرقان** (لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ، ۲۰۰۰ء)، ۱: ع.

[2] القیامۃ: ۱۹.

[3] غلام احمد پرویز، **تفسیر مطالب الفرقان**، ۱: ع.

[4] غلام احمد پرویز، **معارف القرآن**، ۱: ۳۸.

آپ ﷺ کی بیان فرمودہ تشریح و تفسیر کو مانے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں ہے ۔اگر آپ ﷺ کو نعوذ باللہ قرآن کا مصنف مانا جائے جیسا کہ مشرکین مکہ کا عقیدہ تھا اور یہود و نصاریٰ کا ہے، تب بھی مصنف کتاب کی تشریح و توضیح زیادہ قابل قبول ہو گی، اور اگر قرآن کو کتاب اللہ مانا جائے جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی ہے، جیسا کہ حقیقت ہے، تب بھی کسی دوسرے شخص کو تو کیا کسی دوسرے نبی کو بھی آپ ﷺ پر نازل کردہ کتاب کی تشریح و توضیح کا حق اس لئے نہیں کہ نزول قرآن آپ ﷺ پر ہوا ہے، اس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کی بیان کردہ تفسیر و توضیح ہی سب سے زیادہ معتبر و قابل اعتبار ہے۔

حاصل یہ ہے کہ سنت نبوی ﷺ سے اعراض و انحراف کرکے تفسیر قرآن کو کسی بشری قیاس و گمان پر استوار کرنا عقلاً، شرعاً اور اخلاقاً کسی بھی طرح کسی بھی باشعور انسان کے نزدیک درست نہیں ہو سکتا، بالخصوص جب اللہ تعالی نے آپ ﷺ کا اولین منصب رسالت ہی تبیینِ کتاب قرار دیا ہو۔[1] نیز پرویز صاحب کا سارے ذخیرہ احادیث کو ظنی قرار دینا خود بہت بڑا جھوٹ ہے کیونکہ بہت سی احادیث متواتر ہیں جو تمام امت کے نزدیک قطعی الثبوت ہیں، نیز جمہور امت حجیت حدیث کی قائل ہے۔

لغت عرب سے تفسیر:

پرویز صاحب اس اصول اور مصدر پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں جب وہ تفسیر القرآن بالقرآن کا کہتے ہیں اور احادیث کی روشنی میں انکار سے کام لیتے ہیں تب وہ حقیقت میں تفسیر بلغۃ العرب کی ہی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> "اللہ تعالی نے کہا ہے قرآن بلسان عربی میں نازل کیا ہے، علم اللسانیات کے مطالعہ سے یہ حقیقت مجھ پر واشگاف ہو چکی تھی کہ مرورِ زمانہ سے زبانوں کے الفاظ کے معانی میں کس قدر فرق آجاتا ہے، اس لئے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے ضروری ٹھہرا کہ یہ دیکھا جائے کہ زمانہ نزولِ قرآن میں ان الفاظ کے کیا معانی سمجھے جاتے تھے"[2]

اسی طرح لکھتے ہیں:

> "چنانچہ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے محاورہ عرب کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے"[3]

پرویز صاحب کے نزدیک قرآن مجید کا ترجمہ چونکہ ہو ہی نہیں سکتا اس لئے عربی زبان کی مستند کتبِ لغت و تفسیر کی مدد سے قرآن مجید کے تمام الفاظ کے معانی پوری وسعت و جامعیت کے ساتھ متعین کیے جائیں اور اس کے لئے جہاں تک ہو سکتا ہو معلوم کیا جائے کہ نزولِ قرآن یا اس کے قریب تر زمانہ میں ان الفاظ سے کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔

پرویز صاحب کی عبارات میں اس قبیل کی دیگر آراء اور مذکورہ اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے پرویز صاحب تفسیر قرآن میں سب سے زیادہ لغت عرب پر ہی اعتبار کرتے تھے۔

---

[1] النحل: ۴۴.

[2] غلام احمد پرویز، **مطالب الفرقان**، ۱: ع.

[3] غلام احمد پرویز، **تبویب القرآن** (لاہور: ادارہ طلوع اسلام، ۱۹۷۴ء)، ۷.

مذکورہ اصول کا اطلاقی جائزہ:

جمہور تمام مفسرین امت نے تفسیر القرآن بالحدیث والسنۃ کے اصول کا ہر اعتبار سے لحاظ رکھا ہے اور تفسیر قرآن میں اس کی پابندی کا تاریخی تسلسل ہر دور میں نمایاں رکھا ہے۔ لیکن پرویز صاحب جدت طرازی میں ہمیشہ اس اصول سے منحرف اور اسے ترک کرنے کی تلقین بھی بڑی شد ومد کے ساتھ کرتے ہیں ہمیشہ اس بات کا دعوی کرتے رہے کہ وہ قرآنی مفردات کے دور نزولِ قرآن کے مطالب ومفاہیم مراد لیتے ہیں لیکن عملا اپنے نظریات کو درست ثابت کرنے کے لئے انہوں نے مفردات قرآنی میں ایسے دور خیز معانی اور تصورات داخل کر دیے جن کا نزول قرآن کے دور سے دور دور کا کوئی تعلق وواسطہ بھی نہیں ہے۔

قرآنی الفاظ سے عدم تجاوز اور اصول کا جائزہ:

قرآنی الفاظ سے عدم تجاوز پر پرویز صاحب لکھتے ہیں:

> ''قرآن کریم کے الفاظ جس حد تک لے چلیں اس سے آگے مطلق قدم نہ بڑھایا جائے کیونکہ قرآن کا ہر لفظ اپنی جگہ اپنے معنی کے لحاظ کامل اور مقصود کے مطابق ہے وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا[1] اور تیرے رب کے الفاظ سچائی اور معنی کی برابری کے لحاظ سے پورے ہیں، ان کلمات سے آگے بڑھنے میں قرآنی حدود سے تجاوز لازم آتا ہے جو بڑی غلطیوں کا موجب ہو سکتا ہے''[2]

پرویز صاحب اپنے وضع کردہ دیگر اصولوں کی طرح اس اصول پر عمل کرنے قاصر ہی رہے، جس کا اندازہ درج ذیل آیت کریمہ کی ان کی بیان کردہ تفسیر سے لگایا جاسکتا ہے:

> ''وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ''[3]
>
> ''جان لو کہ جو کچھ مالِ غنیمت تم نے حاصل کیا، اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے''

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں پرویز صاحب قواعد زبان کا لحاظ نہ کرتے ہوئے اور الفاظ قرآن سے تجاوز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یاد رکھو؛ میدان جنگ میں جو مالِ غنیمت بھی ملے گا، اس میں پانچواں حصہ خدا اور رسول یعنی مملکت کی انتظامی ضروریات کے لیے رکھ کر باقی ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے میں صرف کیا جائے گا، مثلا میدان جنگ میں جانے والوں اور کام آنے والوں کے اقربا کے لئے، یتیموں اور معاشرہ میں بے یار ومددگار تنہا رہ جانے والوں کے

---

[1] الانعام: ۱۱۵.

[2] غلام احمد پرویز، **معارف القرآن** (دہلی: ادارہ طلوع اسلام، س ن)، ۱: ۳۹.

[3] الانفال: ۴۱.

لئے، ان کے لئے جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو، یا جو کسی حادثے کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہے ہوں، نیز ان مسافروں کے لئے جو مدد کے محتاج ہوں"[1]

مالِ غنیمت کا خُمس ان کا آیت مبارکہ میں مذکور مستحقین کے لیے ہے لیکن پرویز صاحب نے عربی قواعد کو پس پشت ڈالتے ہوئے اور قرآنی الفاظ کی حدود کو پامال کرتے ہوئے پورے ایک خمس کو اللہ اور رسول کے لئے وقف کرتے ہیں جو اسلامی مملکت کے ضروریات کے لئے ہوگا باقی چار حصے رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے وقف کرتے ہیں، حالاں کہ یہ تمام لوگ کلمتہ اللہ میں موجود حرف جار لام ہی کے حرف عطف کے ذریعے تابع ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ ان سب کے لئے ایک ہی خمس ہوگا۔ یہ بات بھی مد نظر رہے کہ پرویز صاحب خود بھی ایک زمانہ میں اسی بات کے قائل تھے لیکن پھر انہوں نے اپنی موجودہ رائے پیش کی، چنانچہ وہ اسی آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"اور جان رکھو جو تمہیں مال غنیمت میں ملے اس کا پانچواں حصہ، اللہ کے لئے، رسول کے لئے رسول کے قرابت داروں کے لئے، یتیموں کے لئے، مسکینوں کے لئے اور مسافروں کے لئے نکالنا چاہیے"[2]

الفاظِ قرآن کا زبان کے مطابق معنیٰ مراد لینا:

اس اصول کے بارے میں پرویز صاحب لکھتے ہیں:

"الفاظ قرآن کے وہی معنی مراد لیے جائیں گئے جو عربی زبان کے مطابق صحیح ہوں، اہل لغت نے جو معانی الفاظ کے لکھے ہیں ان کی بنیاد سمع پر ہے اور کتب لغت کی تدوین جس وقت ہوئی ہے اس وقت بہت سے الفاظ کے معانی تفسیر و حدیث و فقہ میں رائج ہو چکے تھے، وہی لغات میں درج ہوئے اس لئے لغت مسلم ہے لیکن وہ حتمی دلیل نہیں ہے، قرآنی الفاظ کے معانی میں اگر اختلاف واقع ہو تو خود قرآن سے ان کا تعین ہو سکتا ہے"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کے نزدیک لغات بھی قابل اعتبار نہیں ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک ان کی تصنیف کے وقت بہت سی اصطلاحات رائج ہو چکی تھیں، جن کو وہ نہیں مانتے۔

مذکورہ اصول کا اطلاقی و تحقیقی جائزہ:

جہاں تک اس اصول یعنی الفاظِ قرآن کا زبان کے مطابق معنیٰ مراد لینے کا تعلق ہے تو اس پر امت کے جمہور و مستند مفسرین نے ہر دور میں عمل کیا ہے لیکن خود پرویز صاحب نے اس اصول کو بھی اپنے نظریات کے تابع رکھا ہے، جس کی بہت سی مثالیں ان کی تفسیر میں موجود ہیں، مثلاً:

"وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ"[3]

---

[1] غلام احمد پرویز، **مفہوم القرآن**، ۸: ۴۱.

[2] غلام احمد پرویز، **معارف القرآن**، ۴: ۶۲۴.

[3] النمل: ۱۷.

''اور سلیمان کے لیے ان کے سارے لشکر جمع کر دیے گئے تھے جو جنات ،انسانوں اور پرندوں پر مشتمل تھے، چناچہ انہیں قابو میں رکھا جاتا تھا''

اس آیت مبارکہ سے واضح ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا لشکر جن وانس اور پرندوں پر مشتمل تھا، لیکن پرویز صاحب انسانوں کا مانتے ہیں جب کہ جنات اور پرندوں کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''عربی جن، جنا اور جنون کے معنی ہیں چھپا ہوا یہ چونکہ نظر نہیں آتے اس لئے ان کو جن کہا جاتا ہے ،لہٰذا اس آیت مبارکہ میں جن سے مراد صحرا میں چھپے ہوئے انسان ہیں''[1]

طیر سے مراد کے بارے میں پرویز صاحب لکھتے ہیں:

''فرس، مطار، طیار ہوشیار اور تیز رفتار گھوڑے کو کہتے ہیں۔ سورہ نمل میں ہے کہ سلیمانؑ کا لشکر جن، انس، طیر پر مشتمل پر تھا۔ 'جن' سے مراد وحشی قبائل ہیں 'انس' مہذب آبادیاں اور 'طیر' تیز رفتار گھوڑے''[2]

صحرا اور جنگل کے باشندوں کے لئے عربی زبان میں مشہور و معروف لفظ 'اعراب' ہے بلکہ خود قرآن میں موجود ہے؛'قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا'[3] پرویز صاحب کے بقول قرآن نے یہ معروف لفظ چھوڑ کر غیر معروف لفظ استعمال کیا ہے جس سے اہل زبان واقف نہیں، عربی زبان میں وہ معروف و متداول نہیں، اس کے مراد لیے جانے کا کوئی قاعدہ وکلیہ اور قرینہ موجود نہیں ہے۔ پرویز صاحب اپنی دوسری کتاب میں لکھتے ہیں:

'سلیمانؑ کے لشکر میں شہروں کے مہذب باشندے، جنگلوں اور پہاڑوں کے دیو ہیکل وحشی اور قبیلہ طیر کے شاہ سوار سب شامل تھے'[4]

آیت مبارکہ 'حَتَّى إِذَا أَتَوْا عَلَى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يَاأَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ'[5] میں لفظ نمل چیونٹی کے لئے استعمال ہوا ہے جو عربی لغت کے اعتبار سے بے غبار ہے۔ لیکن پرویز صاحب نے نملۃ سے وادی نمل کی حکمران خاتون مراد لی ہے جو عربی کے نسبت کے قواعد کے بھی صریح خلاف ہے۔

پرویز صاحب کی عربی میں مہارت کا جائزہ:

پرویز صاحب کی عربی زبان پر گرفت کافی کمزور تھی اور انہوں نے بعض مقامات پر ایسی سنگین غلطیاں کی ہیں کہ ایک متوسط ذہن کے

---

[1] غلام احمد پرویز، **لغات القرآن**، ۱: ۴۴۷.

[2] ایضاً، ۳: ۱۱۰۵.

[3] الحجرات: ۱۴.

[4] غلام احمد پرویز، **مفہوم القرآن**، ۲: ۸۶۴.

[5] النمل: ۱۸.

مبتدی طالب علم سے بھی ان کا صدور مشکل ہے، عربی زبان پر اتنی کمزور گرفت کے ساتھ کسی بھی شخص کو اخلاقی، قانونی اور مذہبی حق نہیں پہنچتا کہ وہ تفسیر قرآن میں ظن و تخمین سے کام لے لیکن پرویز صاحب نے اپنی اس کمزوری کے باوجود اس وادی میں مکمل چھلانگ لگائی جس کے وہ بالکل بھی اہل نہیں تھے۔ عربی زبان میں کمزوری کا احساس انہیں خود بھی تھا، جس کا اعتراف اپنے استاد اسلم جیراجپوری (م ۱۹۵۵ء) سے پوری کرنے کی خواہش کا اظہار انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا:

> ''میں عربی ادب کی بعض کتابوں میں ناپختگی محسوس کیا کرتا تھا، میں نے چاہا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور عندالفرصت مولانا سے کتابیں پڑھ لوں، چنانچہ غالباً ۱۹۳۵ء میں، میں نے اس کے متعلق مولانا سے ذکر کیا، وہ اس کے لئے بخوشی رضامند ہوگئے، چنانچہ میں شملہ سے دہلی آگیا اور چونکہ مولانا بھی اس زمانے میں اکیلے ہی رہتے تھے، اس لئے یہی فیصلہ ہوا کہ میں انہیں کے ساتھ رہوں، یہ چھ ماہ کا عرصہ میرے زندگی کے یادگار دنوں میں تھا، میں آیا تو تھا عربی ادب کی ناپختگی دور کرنے کے لیے، لیکن ہمارا بیشتر حصہ قرآن کے رموز و غوامض پر بحث و تحقیق میں گزرتا''[1]

پرویز صاحب کا اپنے استاد سے عربی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد بھی یہ حال تھا کہ ان کی تصانیف میں متعدد مقامات پر عربی کی واضح اغلاط موجود ہیں، مثلاً کہیں اسم ظرف کو اسم فاعل، کہیں مضارع کو نہی، تو کہیں امر کو مضارع بنا کر ترجمہ کرتے رہے ہیں؛

ا۔ سورۃ آل عمران میں جب حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ رب العزت کی طرف سے بچے کی بشارت دی گئی تو انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اس کی کوئی نشانی بتلادے، تو اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

''قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ''[2]

پرویز صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے:

''تین دن بات نہ کرو مگر اشارہ سے''[3]

سورۃ مریم میں بھی پرویز صاحب نے یہی اسلوب دہرایا ہے:

''قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا''[4]

''تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین رات لگاتار لوگوں سے بات نہ کر''[5]

'أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ' میں 'تُكَلِّمَ' فعل مضارع ہے جس پر لائے نفی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے 'تو لوگوں سے بات چیت نہ کرے گا یا نہ کرسکے گا' جب کہ انہوں نے اسے نہی سمجھ کر ترجمہ کیا ہے 'تو لوگوں سے بات نہ کر' اگر یہ نہی ہوتا تو 'تُكَلِّمَ' کی میم مفتوح نہیں بلکہ مکسور ہوتی۔

---

[1] محمد دین قاسمی، **تفسیر مطالب الفرقان کا علمی و تحقیقی جائزہ** (لاہور: ادارہ معارف اسلامی، ۲۰۰۹ء)، ۱: ۲۲۲.

[2] آل عمران: ۴۱.

[3] غلام احمد پرویز، **معارف القرآن**، ۳: ۴۵۹.

[4] مریم: ۱۰.

[5] غلام احمد پرویز، **معارف القرآن**، ۳: ۴۶۲.

۲۔اللہ تعالی نے سورۃآل عمران میں منکرین حق سے بیزاری کااظہار کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ انہیں کہہ دیں:

"قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ"[1]

"آپ کہہ دو کہ مرو تم اپنے غصے کے ساتھ"

اس آیت مبارکہ میں 'مُوتُوا' امر کا صیغہ ہے جو ہر مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے، لیکن پرویز صاحب نے ترجمہ کرتے ہوئے اسے فعل مضارع بنادیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یاد رکھو: اگر تم ان ہی خیالات میں غرق رہے، تو تم اپنے غصے کی آگ میں خود ہی بھسم ہو کر خود ہی مر جاؤ گے"[2]

اسی طرح سورۃیوسف میں بھی ایک مقام پر فعل امر کو فعل مضارع قرار دے دیا۔[3]

۳۔اللہ رب العزت نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ آپ اپنے دوستوں سے انتظامی امور میں مشاورت کیا کریں۔ 'وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ'[4] آپ ان سے مشورہ کیجیے اور جب آپ کسی بات کا عزم کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کیجیے۔ اس پر پرویز صاحب لکھتے ہیں:

"عَزَمْتَ صیغہ واحد متکلم ہے۔۔۔ باقی رہا یہ سوال کہ عَزَمْتَ میں صیغہ واحد متکلم کا ہے تو یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ خواہ ہزار افراد سے لیا جائے، فیصلہ تو بہر حال ایک فرد کو ہی کرنا ہوگا"[5]

معمولی عربی جاننے والا بھی جانتا ہے کہ 'عَزَمْتَ' صیغہ واحد متکلم نہیں بلکہ واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔

یہ تو علم الصرف کی چند مثالیں ہیں، اسی طرح علم النحو میں بھی ان کا ادراک محسوس نہیں ہوتا، مثلا عربی زبان کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ مرکب اضافی میں مضاف کبھی معرف باللام نہیں ہوتا، لیکن پرویز صاحب نے اپنی کئی عبارات میں مضاف پر بھی الف لام داخل کردیا ہے، مثلاً:

"جبیر بن مطعم کا بیان ہے کہ حضرت عمر کے آخری حج میں، میں ان کے ساتھ تھا، ہم جبل عرفات پر کھڑے تھے کہ ایک شخص نے پکارا:

"یا خلیفة الرسول اللہ"[6]

---

[1] آل عمران: ۱۱۹.

[2] غلام احمد پرویز، **معارف القرآن**، ۴: ۲۰۸.

[3] غلام احمد پرویز، **تفسیر مطالب الفرقان**، ۷: ۵۲.

[4] آل عمران: ۱۵۹.

[5] محمد دین قاسمی، **تفسیر مطالب الفرقان کا علمی و تحقیقی جائزہ**، ۱: ۲۲۶.

[6] غلام احمد پرویز، **شاہکار رسالت** (لاہور: ادارہ طلوع اسلام، ۱۹۸۷ء)، ۴۳۰.

اسی طرح ایک مقام پر کلمہ (مشہورہ) بایں الفاظ لکھتے ہیں:

"یسوع نے دلی خوشی کے ساتھ جواب دیا بیشک وہ محمد الرسول اللہ ہے"[1]

قرآنی مفردات کے مادوں سے لاعلمی:

پرویز صاحب علم النحو والصرف کی طرح علم الاشتقاق میں مہارت تامہ حاصل نہ تھی اور ان کی کتب میں متعدد مثالیں موجود ہیں جن میں انہوں نے اصلِ مادہ یا اشتقاق بیان کرنے میں غلطی کی ہے۔[2] جن سے پرویز صاحب کی عربی زبان میں مہارت کی حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے لہٰذا اس مہارت و عبور سے وہ جو تفسیر پیش کریں گے انہیں ان کے خود ساختہ نظریات تو کہا جاسکتا ہے لیکن تفسیر قرآن کہنا کسی بھی عقلی و نقلی پیمانے کے مطابق درست اور قابل فہم بات نہیں ہے۔

پرویز صاحب کی لغوی تحقیقات کا تنقیدی جائزہ:

مثال نمبر ا: قربانی کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ"[3]

"آپ فرمادیجیے کہ میری نماز اور میری قربانیاں، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے"

پرویز صاحب یہاں پر لکھتے ہیں:

"اس آیت میں لفظ نسک کے معنی 'قربانی' کیے جاتے ہیں، لغت میں اس مادہ ن س ک کے معنی پاک اور صاف کرنا ہیں۔ نسک الثوب اس نے کپڑے کو دھو کر صاف کیا۔ ارض ناسِکَۃ سرسبز و شاداب زمین جس پر حال ہی میں بارش ہوئی۔ ان بنیادی معانی کی رو سے اس کا مفہوم، کسی معاملے کو درست اور ٹھیک کر لینا ہوتا ہے، نَسَکَ السَبخَۃ کے معانی ہیں، اس نے زمینِ شور کو درست کیا، اسے جھاڑ جھنکار سے صاف کیا، نَسَکَ الی طریقۃ جمیلۃ اس نے اچھا طریقہ اختیار کیا اور پھر اس پر مداومت اختیار کی، راستہ اختیار کر لینے کی جہت سے کلام عرب میں نَسَک، ہر اس مقام کو کہتے ہیں جس پر عام طور پر، آمد و رفت جاری ہو، یہیں سے اس کے معنی، روش اور رسم کے ہو گئے، اور امور حج کو بھی مناسکِ حج کہتے ہیں"[4]

پرویز صاحب نے اپنی تفسیر میں پورا زور صرف کیا ہے کہ نَسَکَ کے معانی کہیں غلطی سے بھی قربانی اور ذبیحہ کے ذکر نہ ہو جائیں، اور اس کے دیگر لغوی معانی بیان کیے ہیں اور قارئین کو یہ تاثر دیا ہے کہ اس کے علاوہ اس کا کوئی معنی نہیں ہے جو میں نے بیان کر دیے

---

[1] غلام احمد پرویز، **تفسیر مطالب القرآن**، ۵: ۴۱۲.

[2] محمد دین قاسمی، **تفسیر مطالب الفرقان کا علمی و تحقیقی جائزہ**، ۱: ۲۲۶۔۲۲۷.

[3] الانعام: ۱۶۲.

[4] غلام احمد پرویز، **تفسیر مطالب الفرقان**، ۳: ۲۴۸.

ہیں، لہٰذا قربانی اس لفظ کے مفہوم میں کسی طور پر بھی شامل نہیں ہے۔

یہاں پر بھی پرویز صاحب نے ایسا کیا ہے کہ نسک کا معنی قربانی اور ذبیحہ بیان کرنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی حالاں کہ کوئی بھی عربی لغت اس سے خالی نہیں ہے۔ چند ایک امثلہ ذیل میں مذکور ہیں:

"والنُّسْكُ بالضم وبضمتين وكَسفينَةٍ: الذَّبيحَةُ"[1]

"وأَصْلُ النُّسك بالضَّمّ وبضَمَّتَيْنِ وكسَفِينَةٍ: الذَّبِيحَةُ أَو النَّسكُ بالفتحِ: الدَّم هكَذا يَقْتَضِي إِطْلاقُه والصّوابُ أَو النُّسُكُ بضَمَّتَيْنِ: الدَّمُ"[2]

"وَالنَّسِيكَةُ الذَّبِيحَةُ وَالْجَمْعُ نُسُكٌ بِضَمَّتَيْنِ"[3]

"والنُّسُكُ والنّسِيكة: الذَّبِيحَةُ وَقِيلَ: النُّسُك الدَّمُ والنَّسِيكة: الذَّبِيحَةُ تَقُولُ: مَنْ فَعَلَ كَذَا وَكَذَا فَعَلَيْهِ نُسُك أَي دَمٌ يُهَرِيقُه بِمَكَّةَ شَرَّفَهَا اللَّهُ"[4]

تمام اہل زبان 'ن س ک' کے مادہ کا معنی تقرب الی اللہ کرتے ہوئے قربانی کو اس کا معنی و مفہوم قرار دیا ہے لیکن پرویز صاحب نے اس کا معنی 'ٹھیک اور درست کرنا' کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک کسی بھی لفظ کا بنیادی معنی وہ ہوتا ہے جو ان کے خود ساختہ نظریہ کی تائید کرتا ہو اگرچہ اہل زبان اسے درست شمار نہ بھی کرتے ہوں۔

مثال نمبر ۲: قربانی سے متعلقہ دوسری آیت مبارکہ 'فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ'[5] 'اپنے رب کے لئے نماز پڑھ اور قربانی کر' ہے۔ پرویز صاحب اس پر لکھتے ہیں:

"لغت کی رو سے نحر سینے کے اوپر کے حصے کو کہا جاتا ہے، صاحب تاج العروس نے مختلف تفاسیر کی سند سے وَانْحَر کے متعدد معانی لکھے ہیں مثلاً 1 نماز میں کھڑے ہو کر سینے کو باہر کی طرف نکالنا 2 نماز میں دایاں ہاتھ بائیں پر رکھنا 3 نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا 4 نماز میں نحر تک ہاتھ اٹھانا 5 اپنے سینے کو قبلہ رخ کر کے کھڑے ہونا، خواہشات کا قلع قمع کرنا"

اسی طرح لکھتے ہیں:

"اونٹ کے ذبح کرنے کا طریق یہ ہے کہ کھڑے کھڑے اس کے نحر سینے کے اوپر کے حصے کے قریب، حلق کی رگ پر نیزہ

---

[1] محمد بن یعقوب فیروز آبادی، **القاموس المحیط** (بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ للطباعۃ والنشر والتوزیع، ۲۰۰۵ء)، ۱: ۹۵۵.

[2] محمد بن محمد مرتضی الزبیدی، **تاج العروس من جواھر القاموس** (بیروت: دار الھدایۃ، س ن)، ۲۷: ۳۷۲.

[3] زین الدین محمد بن أبي بکر الرازی، **مختار الصحاح** (بیروت: المکتبۃ العصریۃ، ۱۹۹۹ء)، ۱: ۳۰۹.

[4] ابن منظور محمد بن مکرم افریقی، **لسان العرب**، (بیروت: دار صادر، ۱۴۱۴ھ)، ۱۰: ۴۹۸.

[5] الکوثر: ۲.

مارتے ہیں، اس سے نحر البعیر کے معنی آتے ہیں، اس نے اونٹ کو اس طرح ذبح کیا، لیکن لغت میں النحر اور النحریر کے معنی ہیں، ماہر، عقلمند، تجربہ کار، ہر بات سمجھ کر اختیار کرنے والا، اس پر مضبوطی سے عمل کرنے والا، 'نحرت الشئی علماً' میں علم کی رو سے اس معاملے پر حاوی ہو گیا"[1]

دوسری کتاب میں لکھتے ہیں:

'اس لئے وَانْحَر کے معنی ہوں گے، اس پروگرام کے متعلق تمام امور پر علم و عقل اور تجربہ و بصیرت سے پوری طرح حاوی ہو کر، ان پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونا'[2]

پرویز صاحب نے اس آیت مبارکہ میں نحر کا معنی 'علمی طور پر کسی معاملے پر حاوی ہونا' بیان کیا ہے۔ یہ قرآن و حدیث اور سلف و خلف کے تو خلاف ہے ہی خود عربی لغت میں بھی اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ پرویز صاحب نے جو محاورہ 'نحرت الشیئ علماً' بیان کیا ہے یہ راقم کو کتبِ لغت و تفسیر میں کمپیوٹر کی مدد سے تلاش کرنے کے باوجود بھی کہیں نہیں ملا اور خود پرویز صاحب نے بھی اس کا کوئی حوالہ ذکر نہیں کیا اور اگر بالفرض اسے درست مان بھی لیا جائے تو لفظ علم اس معنی کی تائید کر رہا ہے جب کہ قرآنی آیت کا معنی قربانی مراد لینے پر دیگر دلائل موجود ہیں یہاں پر علم میں حاوی ہونے کا معنی مراد لینا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

یہاں پرویز صاحب نے اپنے بیان کردہ اصول تفسیر 'الفاظ قرآنی کی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے' کی خود ہی خلاف ورزی ہے۔ کیونکہ صاحب تاج العروس کے حوالے سے جو انہوں نے چھ معانی بیان کیے ہیں ان میں بھی نحر بمعنی سینے کا بالائی حصہ کا بنیادی مفہوم پایا جاتا ہے لیکن پرویز صاحب کا بیان کردہ معنی 'تمام امور میں مہارت، علم و تجربہ میں پوری طرح حاوی ہونا اور عمل پیرا ہونا' تو کسی طرح بھی اس سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کے مقابلے میں مستند مفسرین نے جو ترجمہ کیا ہے 'تو قربانی کر' اس میں لغوی معنی کا بنیادی مفہوم بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ خاص کر اونٹ کی قربانی تو نحر پر نیزے کے ذریعے ہی کی جاتی تھیں اور عرب عام طور پر قربانی کرتے بھی اونٹ کی تھے، اس لئے قربانی کرنے کا لغوی معنی مراد لینا لغوی معنی کے بنیادی مفہوم اور عرب رسم و رواج سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

مثال نمبر ۳: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَاأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ"[3]

"اور قصاص میں زندگی ہے تمہاری اے عقل والوں تاکہ تم ڈرنے والے بن جاؤ"

---

[1] غلام احمد پرویز، **تفسیر مطالب الفرقان**، ۳:۲۴۸۔

[2] غلام احمد پرویز، **لغات القرآن**، ۲:۱۵۸۔

[3] البقرۃ:۱۷۹۔

اس آیت مبارکہ میں قصاص سے کیا مراد ہے؟ عہد رسالت سے آج تک امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ قصاص سے مراد مجرم کو ایسی سزا دینا ہے جس کا اس نے خود ارتکاب کیا ہو گویا قتل کے بدلے قتل، کان کے بدلے کان، ناک کے بدلے ناک، غرض ہر جرم کے مقابلے میں مجرم کو اسی جیسی سزا دینے کا نام قصاص ہے۔ جب کہ پرویز صاحب نے امت کے اس متفق علیہ معنی و مفہوم کو یکسر مسترد کر دیا ہے، چنانچہ پرویز صاحب لکھتے ہیں:

> ''قصاص: اس کے معنی مجرم کو سزا دینا نہیں، بلکہ اسکے معنی ہیں مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ وہ بلا گرفت نہ رہ جائے یعنی قرآنی نظام میں کسی جرم کو Untraced نہیں رہنا چاہیے۔ وہ اس قسم کے محکم نظام تفتیش میں، حیات اجتماعیہ کا راز بتاتا ہے''[1]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''قصاص کسی سزا کا نام نہیں اس لفظ کے بنیادی معنی 'کسی کا پیچھا کرنے' کے ہیں۔ اصطلاحی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ مجرم کا اس طرح پیچھا کیا جائے کہ وہ مواخذہ سے نہ بچ جائے''[2]

پرویز صاحب نے لفظ قصاص کے بنیادی معنی 'کسی کا پیچھا کرنے' کے کیے ہیں۔ جب کہ لغت میں اس کا یہ معنی کہیں بھی نہیں ملتا، بلکہ تمام اہل لغت اس کا معنی بدلہ اور سزا ہی کرتے ہیں۔ مثلاً:

> **''القصاص أن يوقع على الجاني مثل ماجنىٰ النفس بالنفس والجرح بالجرح''**[3]
>
> ''قصاص یہ کہ مجرم کو وہی اور اتنی ہی سزا واقع کی جائے جیسی اور جتنی اس کی جنایت تھی، جان کے بدلے جان اور چوٹ کے بدلے چوٹ''

'القصاص تتبع الدم بالقود'[4] اور قصاص، بدلہ لیتے ہوئے خون کا تعاقب کرنا ہے۔

''والقصاص؛ القود وهو القتل بالقتل او الجرح بالجرح''[5] اور قصاص کا مفہوم بدلہ لینا ہے اور وہ قتل کے بدلے قتل اور زخم کے بدلے زخم ہے۔

یہاں پرویز صاحب نے اپنی رائے کو ثابت کرنے کے لئے وہ معنی مراد لیا ہے جس کا جواز قرآن و حدیث تو کیا دور دور تک عربی لغت سے بھی پیش نہیں کیا سکتا۔

---

[1] غلام احمد پرویز، **تفسیر مطالب الفرقان**، ۳: ۱۷۴.

[2] غلام احمد پرویز، ماہ نامہ، طلوع اسلام (لاہور: فروری ۱۹۸۱ء)، ۶.

[3] ابراہیم مصطفی، **المعجم الوسیط** (بیروت: دار الدعوۃ، س ن)، ۲: ۷۴۰.

[4] حسین بن محمد اصفہانی الراغب، **المفردات فی غریب القرآن** (دمشق: دار القلم، ۱۴۱۲ھ)، ۴۰۴.

[5] ابن منظور، **لسان العرب**، ۷: ۷۶.

پرویز صاحب کے تسامح کی اصل وجہ:

غلام احمد پرویز صاحب نے تفسیرِ قرآن میں مذکورہ متفقہ اصولوں سے انحراف ہی اصل مسئلہ ہے۔انہوں نے قرآن کی زبان کو خود قرآنی تشریحات، توضیحات نبوی، سیاق وسباق، نزول قرآن کے وقت اہل عرب کا عرف واستعمال ہر چیز کو چھوڑ کر محض لغت سے سمجھنے کو سعی لاحاصل کی ہے۔

تفسیر بالعقل اور جائزہ:

کسی قرآنی لفظ کے معنی کی تعیین میں پرویز صاحب عقل پر بھی بہت انحصار کرتے ہیں۔تدبر فی القرآن کی بنیادی شرط بیان کرتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں:

> "جب تک آپ اپنے ذہن کو پہلے سے قائم شدہ نظریات، معتقدات اور تصورات سے پاک نہیں کرلیں گے، قرآن کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکے گا۔جو شخص پہلے سے کوئی خیال قائم کرکے قرآن کی طرف اس لئے آتا ہے کہ اسے اپنے خیال کی سند اور تائید قرآن سے حاصل ہو جائے، اس کی رسائی صداقت تک نہیں ہو سکتی"[1]

کسی بھی لفظ کی تفسیر بیان کرنے میں عقل کے استعمال پر جمہور علماء امت نے چند شرائط لگائی ہیں اور یقیناوہ انسان کو گمراہی وضلالت کے گرداب میں گرنے سے بچاتی ہیں، لیکن پرویز صاحب نے جو اصول بیان کیا ہے وہ بیان کی حد تک تو درست ہے لیکن ان کا تطبیقی پہلو اس سے یکسر مختلف ہے، اور انہوں نے اپنے ذہنی نظریات کو تفسیر قرآن بنا کر جتنا پیش کیا ہے اس ضلالت و گمراہی کی مثال شائید کسی اور تفسیر میں نہیں ملتی۔

خلاصہ ونتائج بحث:

- تفسیرِ قرآن کا بہترین اور عمدہ طریقہ تفسیر القرآن بالقرآن ہے کہ قرآن نے کسی دوسرے مقام پر اس کے متعدد معانی میں سے کسی کی تعیین کی ہے یا نہیں، اگر کی ہے تو وہ ہی معنی مراد لیا جائے گا۔ جبکہ الفاظِ قرآنی کی تشریح و تفسیر سمجھنے کا دوسرا اور معتبر ترین ذریعہ حدیث وسنت رسول ﷺ ہے۔اور اگر کسی لفظ کے لغوی اعتبار سے کئی معانی ہوں اور قرآن وحدیث سے ان میں سے کسی ایک کی تعیین مشکل ہو تو اقوال صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ کیونکہ صحابہ کرام ہی قرآن کے اولین مخاطب تھے۔
- تفسیر قرآن میں جہاں کلامِ عرب کی بہت زیادہ احتیاج وضرورت ہے تو دوسری طرف اگر کلامِ عرب سے تفسیر کرنے کے اصول وضوابط کو نظرانداز کرکے تفسیر کی جائے تو اس سے مفاسد کثیرہ جنم لیتے ہیں۔
- غلام احمد پرویز صاحب نے تفسیر قرآن میں جمہور اصول ومصادر سے انحراف کیا اور احادیث مبارکہ، اقوال صحابہ وتابعین کو تفسیر قرآن میں کوئی اہمیت نہیں دی، بلکہ قرآن کی تفسیر خود قرآن اور عربی لغت سے کرنے کا ایسا اسلوب اختیار کیا جو جمہور سے یکسر مختلف ہے۔

---

[1] غلام احمد پرویز، **مطالب القرآن**، ا: ف.

- غلام احمد پرویز صاحب کی تفسیر اور دیگر کتب سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہیں عربی زبان میں کوئی خاص مہارت نہ تھی۔ چوں کہ ان کا اصل مقصود قرآن کو لغت عرب سے سمجھنا تھا جبکہ عربی پر انہیں مکمل گرفت نہ تھی اس لئے ان کی کتب میں جابجا اغلاط کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز غلام احمد پرویز صاحب نے تفسیر قرآن میں استشہاد بلغۃ العرب کے مسلمہ اصولوں کو بھی پس پشت ڈالا ہے اور اپنی آراء یا مغربی واشتراکی آراء و نظریات کو تفسیرِ قرآن کے لبادے میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

@ 2020 by the author, this article is an open access article distributed Under the terms and conditions of the Creative Commons Attribution CC-BY http://creativecommons.org/licenses/by/4.0/